رسائل و مسائل

توأم لڑکیوں کا نکاح

[ذیل میں جس سوال کا جواب دیا جا رہا ہے، اسے سائل نے مولانا ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کے پاس ملتان جیل میں بھیجا تھا۔ اس کا جواب مولانا نے تحریر کیا ہے جو کہ سنسر ہو کر افسران جیل کی وساطت سے باہر پہنچا ہے۔ مولانا کی خواہش کے مطابق اسے "ترجمان" میں بھی دیا جا رہا ہے تاکہ دوسرے اہل علم بھی اس مسئلے پر غور فرمائیں اور اس کی پوری تحقیق ہو سکے۔]

سوال :۔ مندرجۂ ذیل سطور بغرضِ جواب ارسال ہیں۔ کسی ملاقاتی کے ذریعے بھیج کر ممنون فرمائیں۔

بہاول پور میں دو توام لڑکیاں متحد الجسم ہیں یعنی جس وقت وہ پیدا ہوئیں تو اُن کے کندھے، پہلو کولھے کی ہڈی تک آپس میں جڑے ہوئے تھے۔ اور کسی طرح سے اُن کو جُدا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اپنی پیدائش سے اب جوان ہونے تک وہ ایک ساتھ چلتی پھرتی ہیں۔ اُن کو بھوک ایک ہی وقت لگتی ہے پیشاب پاخانہ کی حاجت ایک ہی وقت ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ اگر اُن میں سے کسی ایک کو کوئی عارضہ لاحق ہو تو دوسری بھی اسی مرض میں مبتلا ہو جاتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ اُن کا نکاح ایک مرد سے ہو سکتا ہے یا نہیں، نیز اگر دونوں بیک وقت ایک مرد کے نکاح میں آ سکتی ہیں تو اس کے لیے شرعی دلیل کیا ہے؟

مقامی علماء تو ایک مرد سے نکاح کی اجازت دیتے ہیں، اور نہ دوسرے۔ ایک مرد سے ان دونوں کا نکاح قرآن کی اس آیت کی رُو سے درست نہیں جس میں بتایا گیا ہے کہ دو حقیقی بہنیں بیک وقت ایک مرد کے نکاح میں نہیں آ سکتیں۔ وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ط

اس حکم کو بنیاد بنا کر اگر دو مردوں کے نکاح میں ان دو متحد الجسم عورتوں کو دے دیا گیا تو مندرجۂ ذیل دشواریاں ایسی ہیں جن کو دیکھ کر علماء نے سکوت اختیار کر لیا ہے۔ مثلاً :-

۱، اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ ایک مرد اپنی منکوحہ نامزد بیوی تک ہی اپنے صنفی تعلقات کو محدود کر سکے گا اور دوسری متحد الجسم عورت سے جو اس کے نکاح میں نہیں ہے تعرض نہ کرے گا۔

۲- یہ دوسری عورت جو اپنی بہن سے متحد الجسم ہونے کے ساتھ متحد المزاج بھی ہے۔ زوجی تعلق کے وقت متاثر نہ ہوگی۔

۳- دو مردوں سے ایسا نکاح جس میں دونوں عورتیں (صنفی تعلقات کے وقت) متاثر ہوتی ہوں اُن کی حیا مجروح ہوتی ہو۔ اُن میں رقیبانہ جذبات پیدا ہوتے ہوں۔ کیا نکاح کی اس روح کے منافی نہیں جس میں بتایا گیا ہے وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً (الروم) وجعل منها زوجها لِيَسْكُنَ اليها (اعراف)

۴- نکاح کا ایک بڑا مقصد انتشار نسل اور والدین اور مولود میں شفقت بھی ہے۔ دو مردوں کا یہ نکاح اس تعلق پر کلہاڑا چلاتا ہے اور بھی مفاسد ہیں جن کے بیان کو یہاں نظر انداز کیا جاتا ہے۔

براہِ کرم شریعت کی روشنی میں اس سوال کو حل کیجیے تاکہ یہ تذبذب دُور ہو۔ ان عورتوں کے والدین ان کا نکاح کر سکیں۔ اور اس فتنہ کا سدباب ہو جو جوان ہونے کی وجہ سے ان کو لاحق ہے۔

جواب - ان دونوں لڑکیوں کے معاملے میں چار صورتیں ممکن ہیں :- ایک یہ کہ دونوں کا نکاح دو الگ شخصوں سے ہو۔ دوسری یہ کہ ان میں سے کسی ایک کا نکاح ایک شخص سے کیا جائے اور دوسری محروم رکھی جائے۔ تیسری یہ کہ دونوں کا نکاح ایک ہی شخص سے کر دیا جائے۔ چوتھی یہ کہ دونوں ہمیشہ نکاح سے محروم رہیں۔ ان میں سے پہلی دو صورتیں تو ایسی صریح ناجائز، غیر معقول اور ناقابلِ عمل ہیں کہ ان کے خلاف کسی استدلال کی حاجت نہیں۔ اب رہ جاتی ہیں آخری دو صورتیں۔ یہ دونوں قابلِ عمل ہیں۔ مگر ایک صورت کے متعلق مقامی علماء کہتے ہیں کہ یہ چونکہ جمع بین الاختین کی صورت ہے جسے قرآن میں حرام قرار دیا گیا ہے۔

اس لیے لامحالہ آخری صورت پر ہی عمل کرنا ہوگا۔ بظاہر علماء کی یہ بات صحیح معلوم ہوتی ہے کیونکہ دونوں لڑکیاں توام بہنیں ہیں اور قرآن کا یہ حکم صاف اور صریح ہے کہ دو بہنوں کو بیک وقت نکاح میں جمع کرنا حرام ہے۔ لیکن اس پر دو سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ کیا یہ ظلم نہیں ہے کہ ان لڑکیوں کو دائمی تجرد پر مجبور کیا جائے۔ اور یہ ہمیشہ کے لیے نکاح سے محروم رہیں؟ اور کیا قرآن کا یہ حکم واقعی اس مخصوص اور نادر صورتِ حال کے لیے ہے جس میں یہ دونوں لڑکیاں پیدائشی طور پر مبتلا ہیں؟

میرا خیال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان اس مخصوص حالت کے لیے نہیں ہے بلکہ اُس عام حالت کے لیے ہے جس میں دو بہنوں کے الگ الگ مستقل وجود ہوتے ہیں۔ اور وہ ایک شخص کے جمع کرنے سے ہی بیک وقت ایک نکاح میں جمع ہو سکتی ہیں ورنہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا قاعدہ یہ ہے کہ وہ عام حالات کے لیے حکم بیان کرتا ہے۔ اور مخصوص، شاذ اور نادر الوقوع یا غیر الوقوع حالات کو چھوڑ دیتا ہے۔ اس طرح کے حالات سے اگر سابقہ پیش آجائے تو تفقہ کا تقاضا یہ ہے کہ عام حکم کو ان پرزوں کاتوں چسپاں کرنے کے بجائے صورتِ حکم کو چھوڑ کر مقصدِ حکم کو مناسب طریقے سے پورا کیا جائے۔

اس کی نظیر یہ ہے کہ شارع نے روزے کے لیے یہ الفاظ صریح یہ حکم دیا ہے کہ طلوعِ فجر کے ساتھ اس کو شروع کیا جائے اور رات کا آغاز ہوتے ہی افطار کر لیا جائے۔ وکلوا واشربوا حتی یتبین لکم الخیط الابیض من الخیط الاسود من الفجر ثم اتموا الصیام الی اللیل۔ یہ حکم زمین کے اُن علاقوں کے لیے ہے جن میں رات دن کا اُلٹ پھیر چوبیس گھنٹوں کے اندر پورا ہو جاتا ہے۔ اور حکم کو اس شکل میں بیان کرنے کی وجہ یہ ہے کہ زمین کی آبادی کا بیشتر حصہ انہی علاقوں میں رہتا ہے۔ اب ایک شخص سخت غلطی کرے گا اگر اس حکم کو اُن مخصوص حالات پر جوں کا توں چسپاں کر دے گا جو قطبِ شمالی کے قریب علاقوں میں پائے جاتے ہیں، جہاں رات اور دن کا طول کئی کئی مہینوں تک ممتد ہو جاتا ہے۔ ایسے علاقوں کے لیے یہ کہنا کہ وہاں بھی طلوعِ فجر کے ساتھ روزہ شروع کیا جائے اور رات آنے پر کھولا جائے۔ یا یہ کہ وہاں سرے سے روزہ رکھا ہی نہ جائے کسی طرح صحیح نہ ہوگا۔ تفقہ کا تقاضا یہ ہے کہ ایسے مقامات پر صورتِ حکم کو چھوڑ کر کسی دوسری مناسب صورت سے حکم کا منشا پورا کیا جائے۔ مثلاً یہ کہ روزوں کے

لیے ایسے اوقات مقرر کر لیے جائیں جو زمین کی بیشتر آبادی کے اوقاتِ صوم سے ملتے جلتے ہوں

یہی صورت میرے نزدیک ان دو لڑکیوں کے معاملہ میں بھی اختیار کرنی چاہیے جن کے جسم آپس میں جڑے ہوئے ہیں۔ اُن کے نکاح دو الگ شخصوں سے کرنے یا سرے سے نکاح ہی نہ کرنے کی تجویزیں غلط ہیں۔ ان کی بجائے ہونا یہ چاہیے کہ ان تجمعوا بین الاُختین کے ظاہر کو چھوڑ کر صرف اس کے منشا کو پورا کیا جائے۔ حکم کا منشا یہ ہے کہ دو بہنوں کو سوکنا پے کی رقابت میں مبتلا کرنے سے پرہیز کیا جائے۔ یہاں چونکہ ایسی صورتِ حال درپیش ہے کہ دونوں کا نکاح یا تو ایک ہی شخص سے ہو سکتا ہے یا پھر کسی سے نہیں ہو سکتا، اس لیے یہ فیصلہ انہی دونوں بہنوں پر چھوڑ دیا جائے۔ کہ آیا وہ بیک وقت ایک شخص کے نکاح میں جانے پر راضی ہیں یا دائمی تجرّد کو ترجیح دیتی ہیں۔ اگر وہ پہلی صورت کو خود قبول کر لیں تو ان کا نکاح کسی ایسے شخص سے کر دیا جائے جو انہیں پسند کرے۔ اور اگر وہ دوسری صورت ہی کو ترجیح دیں تو پھر اس ظلم کی ذمہ داری سے ہم بھی بری ہیں اور خدا کا قانون بھی۔

اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ بالفرض یہ دونوں ایک شخص کے نکاح میں دے دی جائیں۔ اور بعد میں وہ ان میں سے کسی ایک کو طلاق دے دے تو کیا ہو گا۔ میں کہتا ہوں کہ اس صورت میں دونوں اس سے جُدا ہو جائیں گی۔ ایک اس لیے کہ اسے طلاق دی گئی اور دوسری اس لیے کہ وہ اس سے کوئی تمتع نہیں کر سکتا۔ جب تک کہ خلوتِ اجنبیہ کے جرم کا ارتکاب نہ کرے۔ یہی نہیں بلکہ وہ اسے اپنے گھر بھی نہیں رکھ سکتا۔ کیونکہ مطلقہ لڑکی کو اپنے گھر رہنے پر مجبور کرنے کا اسے حق نہیں ہے اور غیر مطلقہ لڑکی اس کے گھر اس وقت تک رہ نہیں سکتی جب تک کہ مطلقہ لڑکی بھی اس کے ساتھ نہ ہو۔ لہٰذا جب وہ ان میں سے ایک کو طلاق دے گا تو دوسری کو خلع کے مطالبے کا جائز حق حاصل ہو جائے گا۔ اگر وہ خلع نہ دے تو عدالت کا فرض ہے کہ اسے خلع پر مجبور کرے۔ یہ لڑکیاں اپنی پیدائش ہی کی وجہ سے ایسی ہیں کہ کوئی شخص نہ ان میں سے کسی ایک کے ساتھ نکاح کر سکتا ہے اور نہ کسی ایک کو طلاق دے سکتا ہے۔ ان کا نکاح بھی ایک ساتھ ہو گا اور طلاق بھی۔ ھٰذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب۔

"زکوٰۃ سے متعلق تصریحات"

پر

اِستدراک

قارئین ترجمان میں سے ایک صاحب نے تحریر فرمایا ہے :-

"رسائل و مسائل کے باب میں ذی الحجہ ۷۳ھ کے پرچے میں زکوٰۃ کے مصارف۔ بیان کرتے ہوئے دو کتابوں کے حوالہ جات تحریر کیے گئے ہیں۔ دونوں میں آپ نے کچھ لفظ کاٹ دیے ہیں۔ "روح المعانی" کی عبارت میں لفظ "فقیر" کاٹ دیا ہے اور "بدائع الصنائع" کے حوالے میں لفظ "محتاج" کاٹ دیا ہے۔ نظر ثانی فرما کر تصحیح فرمائیں۔"

ہم صاحب خط کے توجہ دلانے پر اُن کے شکر گزار ہیں لیکن ان کی شکایت غلط فہمی پر مبنی معلوم ہوتی ہے۔ جہاں تک "بدائع الصنائع" کے حوالے کا تعلق ہے وہ ہم نے الگ اصل کتاب سے نقل نہیں کیا تھا بلکہ "فی سبیل اللہ" کی تفسیر میں صاحب روح المعانی نے جو اقوال نقل کیے ہیں ہم نے طول بحث سے بچتے ہوئے ان میں سے چند ایک کو نقل کر دیا تھا۔ انہی میں سے ایک قول صاحب البدائع کا بھی تھا۔ خط آنے پر جب اصل کتاب "بدائع" کو دیکھا گیا تو معلوم ہوا کہ وہاں "فی سبیل اللہ" کی تعریف کے ساتھ اذا کان محتاجًا کے لفظ تھے مگر روح المعانی میں یہ الفاظ نقل نہیں کیے گئے اور اسی وجہ سے ہمارے حوالے میں بھی یہ الفاظ درج نہیں ہو سکے۔ ہم نے قصداً کسی لفظ کو کاٹنے یا چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ اسی طرح روح المعانی کا بقیہ حوالہ جتنا ہم نے نقل کیا ہے اُس میں سے ہم نے کوئی لفظ کاٹا نہیں تھا۔ البتہ البحر، النہایہ، اور احکام القرآن کے حوالوں کو بھی ہم نے صرف اختصار کے پیش نظر حذف کر دیا تھا۔ ان سارے حوالوں کے نقل نہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جس مقام پر انہیں نقل کیا جا رہا تھا وہاں اصل چیز جو معرض بحث تھی وہ یہ تھی کہ آیا "فی سبیل اللہ" سے مراد محض قتال فی سبیل اللہ ہے یا اس میں نیکی اور بھلائی کے دوسرے کام بھی شامل ہیں۔ اس لیے جو حوالے براہ راست اس بحث سے متعلق

تھے اُن میں سے چند ایک کو نقل کر دیا گیا اور بقیہ کو چھوڑ دیا گیا۔

یہاں ہم مکتوب نگار کی خدمت میں یہ بھی عرض کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ فقہائے احناف نے بالعموم فقراء و مساکین کی مدات کے علاوہ دیگر مدات کے ساتھ بھی فقر و احتیاج کی جو قید لگائی ہے، اگر اس سے یہ مراد لیا جائے کہ مثلاً ایک شخص ایک کام جو فی سبیل اللہ کے تحت ہی یا حج یا جہاد پر جانا چاہتا ہے اُس کے مستحق زکوٰۃ ہونے کے لیے ضروری ہے کہ وہ صاحب نصاب بھی ہو تو ہمیں اس سے اتفاق نہیں ہے۔ بلاشبہ کتب حنفیہ کو دیکھنے سے بظاہر یہ گمان ہوتا ہے کہ اس بارے میں حنفیہ اور شافعیہ میں کچھ اختلاف ہے اور شافعیہ فی سبیل اللہ اور ابن السبیل وغیرہ کی مدات میں سے غنی اور غیر محتاج کو دینا بھی جائز سمجھتے ہیں اور حنفیہ شرطِ احتیاج کو لازم قرار دیتے ہیں۔ لیکن احناف کے مسلک کا بغور مطالعہ کیا جائے تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ زکوٰۃ کا حقدار بننے کے لیے جس قسم کی حاجت مندی کی قید وہ فقراء و مساکین کے علاوہ دوسرے لوگوں کیلیے عائد کرتے ہیں، وہ حاجت اس طرح کی نہیں ہے جس طرح کی فقیر یا مسکین کو گھر بیٹھے بھی لاحق ہوتی ہے، بلکہ وہ حاجت ایسی ہے جو اللہ کی راہ میں ہی لاحق ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک شخص گھر میں کھاتا پیتا ہے، فقیر اور محتاج نہیں ہے بلکہ اسکی زندگی کی ساری ضروریات فراہم ہو رہی ہیں۔ یہی شخص اگر جہاد میں جانا چاہتا ہے، حج پر جانا چاہتا ہے، یا اللہ کی راہ اور سبل الخیرات کے سلسلے میں کوئی اور جد و جہد کرنا چاہتا ہے تو عین ممکن ہے کہ ان کاموں کی انجام دہی کے لیے جس سر و سامان اور جن وسائل و ذرائع کی ضرورت ہے انہیں وہ از خود مہیا نہ کر سکتا ہو۔ ایسا شخص فقہائے حنفیہ کے نزدیک بھی مستحق زکوٰۃ ہے۔ درحقیقت ایسا شخص ایک جہت سے غنی اور ایک جہت سے محتاج ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حنفیہ اسے محتاج قرار دے کر زکوٰۃ کا حقدار سمجھتے ہیں اور شافعیہ اسے غنی قرار دے کر بھی اس کے لیے زکوٰۃ کا لینا جائز قرار دیتے ہیں۔ اس حیثیت سے اگر دیکھا جائے تو فقہاء کی نزاع لفظی رہ جاتی ہے اور احناف و دیگر فقہا کے مابین کوئی حقیقی اختلاف باقی نہیں رہتا۔

اگر ہمیں بارہ طوالت کا خوف نہ ہوتا تو احکام القرآن اور خصوصاً بدائع الصنائع کی وہ پوری بحث نقل کر دی جاتی جو مذکورہ بالا تشریح کی تائید کرتی ہے۔ بہر کیف ... فقہ حنفی میں فقراء و مساکین کے دوسری مدات کے ساتھ احتیاج کی جو قید لگائی گئی ہے اس کا صحیح مدلول یہی ہے۔ اگر اس کی اور تاویل کی جائے گی تو وہ لاتحل الصدقة لغني الا لغاز في سبيل الله ... الخ والی حدیث کے خلاف پڑے گی۔

دنیا دارالعمل ہے یا دارالمکافات؟

سوال:- کتاب "تجدید و احیائے دین" کے صفحہ ۲۶ پیراگراف ۳ پر تحریر فرمایا گیا ہے:-

"یہ دنیوی زندگی چونکہ آزمائش کی مہلت ہے اس لیے یہاں نہ حساب ہے نہ جزا و سزا یہاں جو کچھ ہوتا ہے وہ کسی عملِ نیک کا انعام نہیں ہے بلکہ امتحان کا سامان ہے، اور جو تکالیف، مصائب و شدائد وغیرہ پیش آتے ہیں وہ کسی عمل کی سزا نہیں، بلکہ زیادہ تر اس قانونِ طبعی کے تحت جس پر اس دنیا کا نظام قائم کیا گیا ہے، آپ سے آپ ظاہر ہونے والے نتائج ہیں"

اس مندرجۂ بالا تحریر سے کسی طرح دل کو تسکین نہیں ہوتی۔ پورے غور و فکر کے ساتھ مع سیاق و سباق کئی بار پڑھا اور سمجھنے کی کوشش کی گئی، لیکن مدعا سمجھ میں نہیں آیا۔ مختلف انبیاء علیہم السلام کی امتوں کا ذکر قرآن مجید میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ ان کی امتوں نے جب نبی کی دعوت سے سرکشی کی تو ان پر دنیا میں ہی ذلت، ہلاکت، تباہی اور غلامی مسلط کر دی گئی اور ان پر طرح طرح کے عذاب آئے۔ اس کے برخلاف جس قوم نے اپنے نبی کی دعوت پر لبیک کہا تو ان کو دنیا کی امامت اور پیشوائی سے سرفراز کیا گیا، اور امتِ وسط اور شہداء علی الناس کا خطاب دیا گیا۔ سرکش اور نافرمان اقوام میں بنی اسرائیل، قومِ فرعون، قومِ ثمود، اور قومِ لوط و شعیبؑ وغیرہ پر جو تباہیاں اور عذاب دنیا میں نازل ہوئے تو یہ ان کی نافرمانی اور سرکشی کا انجام تھا۔ آخرت میں تو ان کے لیے دکھ دینے والا بڑا عذاب ہے ہی! اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ دنیا میں بھی عملِ بد اور عملِ نیک کی انسان کو کچھ نہ کچھ سزا مل ہی جاتی ہے۔

اس ضمن میں ایک حدیث بھی آپ دیکھ لیجیے۔ حدیث ۱۷۹۹ بخاری جلد سوم میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: کہ "کسی شخص نے کسی امرِ ممنوعہ کا ارتکاب کیا اور دنیا ہی میں اس کی گرفت ہو گئی تو اس کا کفارہ اور پاکی ہو جائے گی اور اگر خدا اس کی پردہ پوشی کر دے گا تو چاہے اسے بخش دیگا اور چاہے تو عذاب دیگا"

اسی سلسلے میں قرآن مجید سورۂ سجدہ رکوع ۲ کی آیت ولنذیقنھم من العذاب الادنیٰ دون العذاب الاکبر کی تفسیر بھی ملاحظہ ہو۔

اس کے علاوہ ترجمان القرآن جلد ۴۲ عدد ۳۔ ماہ جون ۱۹۵۴ء کے صفحہ ۲۶ پر تحریر ہے کہ:۔

"کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ کوئی شخص جو کسی قوم میں رہ کر معصیتوں کا ارتکاب کرے اور اس قوم کے لوگ اس کو بدلنے کی قوت رکھنے کے باوجود اس کو نہ بدلیں اور پھر اللہ تعالیٰ مرنے سے پہلے ان لوگوں کو اس کی سزا نہ دے دے" (مشکوٰۃ: بحوالہ ابوداؤد)

اس اُلجھن کا حل کیا ہے؟

جواب۔ یہ سوال جس حقیقت سے متعلق ہے وہ ایک پیچیدہ حقیقت ہے۔ اس کے کئی پہلو ہیں، اور اگر ایک سوال کے جواب میں ایک پہلو واضح کر دیا جائے تو دوسرے پہلوؤں کے متعلق نئے سوالات پیدا ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا ہم اجمالاً وہ سارے پہلو بیان کر دیتے ہیں جن کو سامنے رکھنے سے آپ اپنے سوال کا جواب بھی پا سکتے ہیں اور اس سے متعلق دوسرے سوالات کے بارے میں بھی از خود حقیقت تک پہنچ سکتے ہیں۔

(۱) "تجدید و احیائے دین" کا کوئی نسخہ راقم الحروف کے پاس اس موقع پر نہیں ہے کہ عبارت کو اس میں دیکھا جا سکے۔ تاہم اس کا منشا واضح ہے۔ یہ عبارت اس دنیا کی حیاتِ انسانی کی عمومی نوعیت کو بیان کرتی ہے کہ یہاں کا نظام فی الجملہ اخلاقی قوانین پر نہیں چل رہا بلکہ قانونِ طبعی کے تابع ہے۔ اس زندگی میں اخلاقی لحاظ سے حساب کتاب اور جزا و سزا کا عمل واقع نہیں ہوتا بلکہ بہ حیثیت مجموعی یہ نظام امتحان و آزمائش کا نظام ہے۔ اسی حقیقت کو اللہ تعالیٰ نے خود واضح فرمایا ہے کہ:۔

الذی خلق الموت والحیٰوۃ لیبلوکم ایکم احسن عملاً — وہ کہ جس نے موت اور زندگی کو بنایا تاکہ تمہاری جانچ کرکے دیکھے کہ کون تم میں سے بہتر عمل کرتا ہے۔

آزمائش اور امتحان کی حالت اسی صورت میں برقرار رہتی ہے جبکہ انسان کے لیے ایمان اور کفر یا نیکی اور بدی کے دونوں راستے کھلے ہوں اور وہ جدھر چاہے اپنی آزادی سے گام زن ہو سکے۔ اب

اگر یہاں کا نظام اخلاقی قانون پر چل رہا ہوتا اور ایک قاتل قتل کرتے ہی طبعی طور پر خود اپنی جان سے ہاتھ دھوتا، چور کا ہاتھ چوری کرتے ہی کٹ جاتا، زانی پر زنا کرتے ہی آسمان سے پتھر برسنے لگتے، دین سے روگردانی کرتے ہی آدمی پر عذاب الٰہی کے آتشیں شعلے حملہ آور ہو جاتے تو امورِ دینی و اخلاقی میں ویسی ہی جبریت پیدا ہو جاتی جیسی امورِ طبعی میں کارفرما ہے۔ ایسی صورت میں ہر فردِ انسانی چاروناچار مومن صالح ہوتا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے حیاتِ ارضی میں "لا اکراہ فی الدین" کی حالت قائم فرمائی ہے۔ اس میں صرف عقلی حیثیت سے رشد و غیّ کا امتیاز پیدا کرنے کے لیے انبیاء کی بعثت ہوتی رہی ہے اور کتبِ آسمانی کا نزول جاری رہا ہے۔ دین و اخلاق میں طبعی جبریت نہیں رکھی گئی۔

یہاں ایسا نہیں ہے کہ جو شخص مومن صالح ہو اس کی صحت اچھی رہے، اس کی کھیتی زیادہ پھل دے، اس کی تجارت کا نفع خود بخود بڑھ جائے، اسے کوئی حادثہ پیش نہ آئے، وہ موت سے بالاتر رہے، اور اسی طرح جو کوئی ایمان اور نیکی سے ہٹ کر زندگی بسر کرے، تمام کی تمام بیماریاں اسی پر حملہ آور ہوں، وہ فاقوں مرا کرے، اس کی کھیتی بنجر رہے، اس کی تجارت میں خسارہ ہوا کرے اور حادثات تاک کر اسی پر حملہ آور ہوں۔ بلکہ یہاں کا طبعی نظام اپنے مجموعی عمل کے لحاظ سے ہر ایک سے یکساں سلوک کرتا ہے۔ یکمن یا سنکھیے کی تاثیر فرد فاسق کے لیے بھی وہی ہے جو مومن و مسلم کے لیے ہے، گرمی اور سردی کا اثر ظالم کے لیے بھی ویسا ہی ہے جیسا عادل کے لیے ہے، بیماری اور صحت کا قانون باطل کے علمبرداروں کے لیے بھی اسی طرح عمل کرتا ہے جس طرح حق کے پرستاروں کے لیے! طبعی قانون کے تحت یہاں ایک قسم کے اسباب سے ایک ہی قسم کا نتیجہ ہمیشہ برآمد ہوتا ہے اور تجربہ سے اسے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اخلاقی قانون چونکہ یہاں کا اصل کارفرما قانون نہیں ہے لہٰذا امورِ دینی و اخلاقی میں ایک سبب سے ایک لازمی نتیجہ کو وابستہ نہیں کیا جا سکتا۔ ایک شخص بھلی زندگی گذارتا ہے اور کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے اچھے نتائج سے دوچار ہو، لیکن دوسری طرف بکثرت ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ فقر و فاقہ، بیماری و حادثات اور مخالفتوں اور مزاحمتوں کا ہدف بنا رہتا ہے۔ دوسری طرف ایک شخص مجرمانہ زندگی بسر کرتا ہے اور کبھی وہ اپنے کسی جرم کا کچھ برا صلہ بھی پا لیتا ہے

لیکن بے شمار مثالیں ایسی سامنے آتی ہیں کہ وہ پوری زندگی عیش و تنعم میں گذار کر رخصت ہو جاتا ہے اور اس کے اعمال کے نتائج برآمد ہوتے نظر نہیں آتے۔ جس طرح ہم امورِ طبعی میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہائیڈروجن اور آکسیجن کے سالموں کی باہمی ترکیب سے لازماً پانی بن جائے گا اس طرح امورِ دینی و اخلاقی میں یہ حکم نہیں لگایا جاسکتا کہ فلاں خیال اور فلاں عمل کے نتیجے میں لازماً فلاں صورت ظہور پذیر ہوگی۔ اس دنیا میں کسی کو مبتلائے مصیبت پاکر ہم یہ حتمی فیصلہ صادر نہیں کر سکتے کہ یہ شخص کسی اخلاقی جرم کا حساب دے رہا ہے، اور نہ کسی کو نعمت سے سرفراز پاکر یہ قطعی رائے دے سکتے ہیں کہ یہ شخص اپنی کسی نیکی کا پھل کھا رہا ہے۔

پھر یہ واضح ہے کہ اگر اخلاقی اعمال کے نتائج طبعی طور پر اسی دنیا میں پوری طرح برآمد ہو جایا کرتے تو انسانی معاشروں کو قانون و عدل کے مختلف نظام قائم کرنے کی سرے سے ضرورت ہی پیش نہ آتی۔ قضاء و قصاص کے نظام کا خود شریعتِ الٰہیہ کی طرف سے نافذ کیا جانا اس امر کی دلیل ہے کہ ہماری حیاتِ ارضی میں طبعی طور پر اخلاقی جزاء و سزا کا اہتمام نہیں پایا جاتا اور اسی خلاء کو نظامِ قضا و قصاص سے ایک حد تک بھرا جاتا ہے۔ لیکن قضاء و قصاص کا نظام بھی انسانی علم و اختیار کی کوتاہی کی وجہ سے چونکہ ناقص رہ جاتا ہے، یعنی نہ تمام افراد کے اعمال کا پورا پورا احتساب ممکن ہے اور نہ ہر نیکی اور بدی کی جزاء و سزا دینا کسی انسانی نظام کے بس میں ہے، لہٰذا مکمل محاسبہ و جزا کو آخرت پر معلق رکھا گیا ہے۔ یوم الدین کی ضرورت ہی یہی ہے کہ حیاتِ ارضی میں چونکہ انسانی اعمال کے محاسبہ و جزا کا کام مکمل نہیں ہو سکتا، لہٰذا اس کی تکمیل کے لیے ایک آخری عدالت ہونی چاہیے جس کے علم سے کسی کا کوئی عمل باہر نہ رہے اور جس کے حدودِ اختیار سے کسی کے اعمال کی جزاء و سزا کا دینا بالاتر نہ ہو۔

پس تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ہماری حیاتِ ارضی فی الجملہ اخلاقی قوانین کے تسلط میں نہیں، بلکہ اس پر مکمل کارفرمائی طبعی عوامل کی ہے۔ یہ طبعی عوامل جتنا موقع اخلاقی قوانین کو کام کرنے کا دیتے ہیں، اتنا اثر ان کا نمودار ہو جاتا ہے اور جہاں یہ موقع نہیں دیتے وہاں اخلاقی قوانین کے تقاضے پورے نہیں ہو سکتے۔

(۲) لیکن اس طبعی نظم کو ہم ایک ایسا اندھا مشینی نظم نہیں مانتے جو اللہ تعالیٰ کے تصرف کے بغیر چل رہا ہے اور جس میں اس کا بنانے والا بالکل بالائے طاق ہو کر رہ گیا ہے۔ بڑے اور چھوٹے جتنے بھی واقعات و حوادث اس نظم کے تحت حیاتِ انسانی کو پیش آ رہے ہیں ان کے پیچھے گوناگوں مصلحتیں اور حکمتیں کام کرتی ہیں۔ اس حقیقت کا سب سے زیادہ علم ہمیں سورۂ کہف کے تینوں قصوں سے حاصل ہوتا ہے۔ خصوصیت سے وہ مشہور قصہ جس کے کردار کو مفسرین نے خضر علیہ السلام کے نام سے پیش کیا ہے، تمام تر اسی بات کی وضاحت کے لیے نبی صلعم پر وحی کیا گیا ہے کہ واقعات و حوادث کے پیچھے مشیتِ الٰہی کا دستِ تصرف کن حکمتوں اور مقاصد کے ساتھ کام کر رہا ہے۔ مگر یہی قصہ اس امر پر بھی دلالت کرتا ہے کہ مشیت کے سامنے لگی بندھی کوئی ایک حکمت و مصلحت ہی نہیں، بلکہ ہر واقعہ کے پیچھے ایک علیحدہ مقصدیت پائی جاتی ہے۔ ایسا ہو سکتا ہے کہ بعض طبعی واقعات کے پیچھے اخلاقی امور سے متعلق کوئی حکمت کام کر رہی ہو، مثلاً کسی بندۂ صالح کو کسی نعمت سے نوازنا یا کسی مصیبت سے بچانا، کسی متذبذب کو ہدایت کی طرف متوجہ کرنا، یا کسی مجرم کو سزا دینا یا دوسروں کے لیے عبرت بنا دینا مطلوب ہو۔ لیکن اور بے شمار حکمتیں ہیں۔ مثلاً بہت سے واقعات محض اس لیے ہوتے ہیں کہ ان کے بل پر مشیت مخلوق کی رزق رسانی کا سر و سامان کرتی ہے۔ بہت سی مصیبتیں افراد کو اس لیے پیش آتی ہیں کہ ان کو عظیم تر مصیبتوں سے بچانا یا کوئی بڑا فائدہ پہنچانا مدنظر ہوتا ہے، اسی طرح بہت سی راحتیں لوگوں کو اس لیے پیش آتی ہیں کہ ان کی اوٹ میں کاروانِ مصیبت مارچ کرتا آ رہا ہوتا ہے۔ بہت سے حوادث کا منشا یہ ہوتا ہے کہ بندوں کی نیتوں اور ان کے دعووں کی جانچ کر کے اور ان کو اپنی صلاحیتوں کے ظاہر کرنے کا پورا پورا موقع دے کر ان میں سے کھوٹے اور کھرے مال کو چھانٹ دیا جائے۔ بہت سے انعامات اور بہت سے مصائب اس لیے نازل ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بعض بندوں کو آئندہ کے کچھ معرکوں کے لیے ان کے ذریعے تربیت دیتا ہے۔ اور بہت سے احوال سے افراد کو اس لیے گذرنا پڑتا ہے کہ کائنات یا عالم انسانی کی کسی بڑی اور مجموعی مصلحت کے لیے ایسا ضروری ہوتا ہے۔

اس لیے فی الجملہ اس امر پر ایمان رکھتے ہوئے کہ حیاتِ ارضی کے واقعات و حوادث میں اللہ تعالیٰ کی مصلحتیں اور حکمتیں کارفرما ہیں اور کوئی پتہ بھی کسی اہم مقصد کے بغیر حرکت میں نہیں آتا، یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ ہر واقعہ میں اخلاقی جزا و سزا کا قانون اثر انداز ہو رہا ہے۔

(۳) انسان کی حیاتِ اجتماعی ٹھیک وہاں سے شروع ہوتی ہے جہاں سے اخلاقی مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ ایک سے زیادہ افراد جب یکجا رہنے بسنے کا آغاز کرتے ہیں اور ان کے درمیان معاملات واقع ہونا شروع ہوتے ہیں تو انسان فوراً نیکی اور بدی، راستی اور ناراستی، ظلم اور انصاف، دیانت اور خیانت، ایفاءِ عہد اور بدعہدی کے امتیاز کی سرحد میں داخل ہو جاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ ہیئتِ اجتماعی کی اساس اخلاق پر قائم ہے۔ چنانچہ یہ بالکل امرِ واقعہ ہے کہ قوموں اور معاشروں اور سلطنتوں اور تمدنوں کے وجود پر اخلاقی قانون ٹھیک اسی طرح عمل کرتا ہے جس طرح طبیعی قانون۔ اجتماعی زندگی جب بھی صحیح اخلاقی قدروں پر استوار ہوتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی عنایات سے بہرہ ور ہو کر خود مضبوط اور چھا جانے والی قوت بنتی ہے اور افراد کو حیاتِ مطمئنہ اور حیاتِ طیبہ کی نعمتوں سے مالا مال کرتی ہے۔ قرآن بتاتا ہے کہ صالح معاشروں کو پھلنے پھولنے کا پورا موقع دیا جاتا ہے۔ بخلاف اس کے اجتماعی زندگی اگر اللہ تعالیٰ کی ہدایت سے منحرف ہو کر اخلاقی قانون سے روگردانی کرتی ہے اور اپنے اندر سے ایک فاسد نظام کو پرورش دیتی ہے تو وہ تمام افراد کو "معیشۃً ضنکًا" کی حالت میں مبتلا کر دیتی ہے۔ قرآن تاریخ میں سے ان تمام اقوام کی مثالیں بطور شواہد پیش کر کے جن کا حوالہ آپ نے دیا ہے، اللہ تعالیٰ کے اس قانون کو واضح کرتا ہے کہ ایسی قوموں اور تمدنوں کو پوری طرح متنبہ کیا جاتا ہے اور اگر وہ اپنی اصلاح کرنے پر تیار نہ ہوں تو ان کو ملیامیٹ کر دیا جاتا ہے۔

اجتماعی زندگی کی قوت، اس کی معیشت، اس کا دفاع، اس کا نظامِ عدل، اس کا امن، اس کا رابطۂ اخوت، اس کا جذبۂ حمیت، اور اس کا ولولۂ ترقی سب کچھ ظہور ہوتا ہے اس کے افراد کے افکار و اعمال کا! افراد کے خیالات اور اعمال قطرہ قطرہ کر کے اجتماعی زندگی کے تالاب کو بھرتے ہیں۔ پھر اس تالاب میں جو امرت یا جو زہر جمع ہوتا ہے اسی سے سارا نظامِ تمدن سیراب ہوتا ہے۔ اگر پاکیزہ خیالات اور اعمالِ صالحہ غالب رہتے ہیں تو ایک صالح نظام برپا ہوتا ہے اور اس شجرۂ طیبہ کے پھل میں سے تمام افراد

بلکہ ان کی آئندہ نسلوں کو بھی حصہ ملتا ہے۔ اگر گندے خیالات اور اعمالِ فاسدہ کا زور ہوتا ہے تو ایک نظامِ فاسد اُبھرتا ہے اور اس کے کانٹوں سے تمام افراد کی جھولیاں بھرتی ہیں بلکہ ان کی بعد کی نسلوں کو بھی ان کی چبھن میں شریک ہونا پڑتا ہے۔

لیکن اجتماعی زندگی میں جو نتائجِ اخلاقی قانون کے تحت ابھرتے ہیں، وہ فرد فرد کے اعمال کا حساب الگ الگ نہیں چکاتے، بلکہ وہ ہزارہا افراد کے رات دن کے اچھے اور بُرے اعمال کا ایک مجموعی جواب بن کے سامنے آتے ہیں اور پھر ان نتائج سے اچھا یا بُرا جو حصہ افراد کو ملتا ہے وہ بھی اس امتیاز کے ساتھ نہیں ملتا کہ کون نیک ہے اور کون بد، اور کس کی نیکی یا بدی کی مقدار کیا تھی! اخلاقی مسئلے میں اصل پیچیدگی یہی ہے کہ ذمہ داری اور جوابدہی کا سرچشمہ تو ہے فرد، اور اس کے اعمال کے نتائج برآمد ہوتے ہیں تو اجتماعی زندگی کے احوال و شئون کی معرفت، اور پھر مزید پیچیدگی یہ کہ اُن مجموعی نتائج کی بھلائی سب کے بھلے کا ذریعہ بنتی ہے اور انکی برائی میں سب کا بُرا ہوتا ہے۔ ہم ایک فرد کے فکر و عمل کا نتیجہ اسی فرد کی زندگی میں تلاش کرنا چاہتے ہیں کہ اس نے فلاں کام کیا تو اسے پلٹ کر کیا ملا، اور یہاں ہم متضاد حالات دیکھ کر سکتے میں پڑ جاتے ہیں کہ شاید اس زندگی میں اخلاق کی سرے سے کوئی اہمیت ہی نہیں۔ اخلاق کی اہمیت ہے، لیکن اخلاق چونکہ اجتماعی معاملہ ہے لہٰذا اس کے اثرات و نتائج بھی اجتماعی زندگی میں تلاش کیے جانے چاہئیں۔ ٹھیک اسی طرح جیسے کسی مشین کے ایک پرزے کی خرابی صرف اسی پرزے کو متاثر نہیں کرتی بلکہ مشین بحیثیت مجموعی اس سے اثر پذیر ہوتی ہے اور اس کے عمل میں فساد آتا ہے تو ہر پرزہ اس فساد میں سے حصہ پاتا ہے، اسی طرح فرد کے اخلاقی صلاح و فساد کے اثرات پلٹ کر اسی فرد ہی پر نمودار نہیں ہو جاتے بلکہ پورے نظامِ معاشرہ میں اس کا فکر و عمل پے در پے لہریں پیدا کرتا ہے جو ایک نقطے سے شروع ہو کر ساحل تک جا پہنچتی ہیں اور قطرے قطرے میں جنبش آجاتی ہے۔

کیا ہم یہ نہیں دیکھتے کہ خدا کے انبیاء اور ان کے صحابہ و حواریین اور بے شمار صلحاء ایسے تھے جنہوں نے حق کی علمبرداری اور نوعِ انسانی کی سچی خدمت میں اپنی عمریں صرف کر دیں، لیکن اگر ان کے کارناموں کا نتیجہ ہم ان کی اپنی زندگیوں میں تلاش کریں تو فقر و فاقہ، ہجرت، عقوبت، قید، تازیانوں اور شہادت کے سوا ہمیں کچھ نہیں ملتا۔ بخلاف اس کے دورِ قدیم کے فراعنہ و نماردہ، اور عہدِ حاضر کے حکمرانوں، سرمایہ داروں، جاگیرداروں،

عیش پرستوں اور جنادری مجرموں کو آپ دیکھیں گے کہ وہ پوری بے باکی سے خدا کے بندوں پر ظلم توڑتے ہیں، انسانیت کی راہ میں مصائب کے کانٹے بوتے ہیں، ایک ایک اخلاقی قدر کی جڑیں کھودتے ہیں، لیکن جب ہم ان کے اعمال کے نتائج خود ان کی زندگیوں میں دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں وہاں دولت کی ریل پیل ملتی ہے، حشم و خدم کے ہجوم نظر آتے ہیں، اور نعم و لذائذ کی کثرت دکھائی دیتی ہے۔ اول الذکر گروہ صلحا نیکی کے جو بیج تاریخ میں بوتا رہتا ہے وہ ایک وقت لے کر پروان چڑھتے اور پھر دنیا کی دنیا ان کے پھل کھاتی ہے، اسی طرح مؤخر الذکر گروہ فساق بدی کی جو نخل بندی کرتا رہتا ہے اس سے بھی کچھ عرصے میں جا کر برگ و بار ظہور پذیر ہوتے ہیں اور اس وقت کروڑوں بندگانِ خدا کو اجتماعی زندگی کے واسطے سے ان کی تلخیوں کو بھگتنا پڑتا ہے۔ بھلائی اور برائی کے کتنے ہی خزانے ہیں جو نظامِ تمدن کے واسطے سے ایک نسل کو اپنی سابق نسل کی طرف سے ورثہ میں ملتے ہیں، اور اسی طرح نعمتوں اور مصیبتوں کے کتنے ہی چمن اور خارزار ہوتے ہیں جنہیں موجودہ نسل آئندہ نسل کے سپرد کر رخصت ہوتی ہے۔ یہ جنگیں اور انقلاب، یہ معاشی ناہمواریاں، یہ فسق و فجور، یہ افلاس اور ضعف یہ غلامی اور باہم آویزی جن سے اقوامِ عالم دوچار ہوتی رہتی ہیں، کون اس امر کو مشخص کر سکتا ہے کہ ان میں بے شمار افرادِ انسانی کو مبتلا کر دینے کی ذمہ داری کس کے حصے میں کتنی آتی ہے۔

اور کیسے یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ ان کا وبال صرف ان کے ذمہ دار افراد تک محدود رہتا ہے اسی طرح راستی اور امن و انصاف کا کوئی نظامِ سعادت کسی گروہ کے حصے میں آیا ہو تو یہ تحقیق کہاں ممکن ہے کہ اس کی تعمیر میں کس نے کتنا حصہ ادا کیا اور کیسے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس نظامِ سعادت کی برکات اس کے معماروں ہی کی جھولی میں پڑیں گی۔

ایک نظامِ باطل کے اندر سے جو لوگ اٹھ کر ایک نظامِ سعادت کی دعوت دیتے ہیں ان کو عمریں مصیبت اور کشمکش میں گذارنی پڑتی ہیں اور اسکی تعمیر کے لیے اپنی ہڈیاں اور اپنا گوشت اور اپنا خون مسالے کے طور پر پیش کرنا پڑتا ہے۔ بظاہر ان کو اس کا کوئی صلہ نہیں ملتا۔ اس کام کی بنیاد ایک جذبۂ ایثار پر ہوتی ہے اور اس میں صرف رضائے الٰہی کو مدِ نظر رکھا جاتا ہے۔ اسی لیے اس کام کے کرنے والوں کو صاف صاف بتا دیا گیا ہے کہ:-

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ۔

اور ہم تم کو خوف اور بھوک اور مالوں اور جانوں اور فصلوں کے کچھ نقصانات سے دوچار کرکے آزمائش میں ڈالیں گے۔ (اے نبیؐ!) بشارت دیجیے صبر کیشوں کو، کہ جو (راہ حق میں) کسی مصیبت کے پیش آجانے پر پکار اٹھتے ہیں کہ ہم اللہ کے (بیے وقف) ہیں اور ہمیں لوٹ کر اسی کے حضور جانا ہے۔

یہی انتباہ دوسرے مقام پر یوں بھی دیا گیا ہے کہ "کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ (بس یونہی) جنت میں جا پہنچو گے، حالانکہ ابھی تک (راہ حق میں) اللہ نے تم کو اس طرح (آزمائش میں) لیا ہی نہیں جس طرح تم سے پہلے گذر جانے والوں کو لیا تھا۔ ان کو سختی اور مصیبت پیش آئی اور وہ خوب جھنجھوڑے گئے، یہاں تک کہ رسول اور اس کے ساتھ ایمان لانے والے چیخ اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی!" اسی بات کو آنحضور صلعم نے یوں بیان کیا ہے کہ جنت تکالیف سے گھری ہوئی ہے (او کما قال)

اب آپ خود سوچیے کہ جب اللہ اور اس کا رسولؐ خود صراحت سے فرما رہے ہیں کہ راہِ حق پر چلنے والوں کو طرح طرح کے مصائب کی آزمائشوں سے گذرنا پڑتا ہے، اور پھر یہ بھی ضروری نہیں ہوتا کہ ان کی جدوجہد ان کے روبرو نتائج برآمد کر دے (اما نرینک بعض الذی نعدك او نتوفینك) تو ایسی حالت میں کسی مخلص مومن کو آپ فقر و فاقہ، یا خانہ بدوشی، یا قید و بند یا قتل کے مراحلِ آزمائش میں سے گزرتے ہوئے کس طرح یہ رائے قائم کرسکیں گے کہ یہ شخص ضرور عند اللہ مجرم ہے اور اپنے کیے کی سزا پا رہا ہے۔ اسی طرح مخالفینِ حق کو برسرِ اقتدار یا نعمتوں سے شاد کام پاکر آپ کس طرح یہ دعویٰ کرسکیں گے کہ یہ لوگ ضرور ایمان و اخلاق میں پیش پیش ہیں اور اپنی نیکی کا پھل کھا رہے ہیں۔

پس اگرچہ قوموں اور تمدنوں کا معاملہ اخلاقی قانون کے عمل کے تابع ہے، لیکن افراد کے اعمال کا حساب حیاتِ ارضی میں نہیں چکتا بلکہ وہ اجتماعی بناؤ اور بگاڑ میں جو حصہ ادا کر جاتے ہیں اس کا جائزہ لینے اور اس کا بدلہ دینے کے لیے آخرت کی عدالت ناگزیر ہے۔

(۴) ایک معاشرہ میں اگر کسی برائی کا ارتکاب کیا جائے اور وہ اس کی روک تھام نہ کرے بلکہ اس کے منفی تعاون کی وجہ سے وہ برائی جڑ پکڑے، پھلے پھولے اور اپنے مفاسد سے سارے ماحول کو متاثر کر دے تو اللہ کا قانون یہی ہے کہ وہ سارا معاشرہ اس برائی میں حصہ دار قرار پاتا ہے اور اس کا خمیازہ بھگتتا ہے۔ واضح رہے کہ یہ قانون بھی اجتماعی زندگی سے متعلق ہے، نہ کہ افراد سے!

(۵) حدیث میں یہ بات مختلف طریقوں سے بیان کی گئی ہے کہ ایک مومن صالح جس کی مجموعی زندگی اللہ کی وفاداری پر استوار ہو، جو دانستہ حق سے انحراف کرنے والا اور کسی برائی پر اصرار کرنے والا نہ ہو، اور جو اپنی غلطیوں کا احساس کرتے ہی نادم ہونے اور توبہ کرنے پر مائل ہوتا ہو، اس سے بہ تقاضائے بشریت جو گناہ سرزد ہو جائیں ان میں سے جن کا انکشاف دنیا میں ہو گیا اور قضا و قصاص کی صورت میں معاملہ چک گیا تو چک گیا، لیکن بقیہ لغزشیں جن پر اللہ تعالیٰ نے پردہ ڈال دیا، ان کا کفارہ وہ تکالیف اور مصیبتیں ہو جائیں گی جو ارضی زندگی میں طبعی طور پر پیش آتی ہیں، بشرطیکہ ایک بندہ ان کا سامنا اللہ کی رضا کے مطابق صبر کے ساتھ کرے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا ایک فضل خاص ہے جو وہ اپنے بندوں کی وفاداری کے صلے میں فرماتا ہے کہ ان کی لغزشوں کی سزا وہ طبعی تکالیف سے مجرا کر دیتا ہے۔ اس سے یہ بات نہیں نکلتی کہ طبعی تکالیف اور مصائب اخلاقی اعمال کے نتائج ہیں۔

ختمِ نبوت کے خلاف قادیانیوں کے دلائل

سوال۔ قادیانی حضرات قرآن کی بعض آیات اور بعض احادیث سے بھی ختمِ نبوت کے خلاف دلائل فراہم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً وہ سورۂ اعراف کی آیت یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ اِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ رُسُلٌ مِّنْکُمْ . . . کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ قرآن کے نزول اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد اس آیت کا خطاب امت محمدیہ سے ہی ہو سکتا ہے۔ یہاں بنی آدم سے مراد یہی امت ہے اور اسی امت کو خطاب کر کے فرمایا گیا ہے کہ اگر "کبھی تمہارے پاس تم میں سے رسول آئیں . . ." اس سے

قادیانیوں کے بقول نہ صرف امتی انبیا بلکہ امتی رسولوں کا آنا ثابت ہوتا ہے۔ دوسری آیت سورۂ مومنوں کی ہے جس میں آغاز یَا اَیُّھَا الرُّسُلُ سے ہوتا ہے۔ اس سے بھی ان کے نزدیک رسولوں کی آمد ثابت ہوتی ہے۔ اسی طرح قادیانی حدیث "لو عاش ابراھیم لکان نبیًا (اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے ابراہیم زندہ رہتے تو نبی ہوتے) سے بھی امکانِ نبوت کے حق میں استدلال کرتے ہیں۔ براہ کرم ان دلائل کی حقیقت واضح فرمائیں۔

جواب: قادیانیوں کے جو دلائل آپ نے نقل کیے ہیں وہ بھی اُن کے اکثر دلائل کی طرح سراسر گمراہ کن مغالطہ آمیزی پر مبنی ہیں۔ آیت یَا بَنِیْ اٰدَمَ اِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ رُسُلٌ مِّنْکُمْ یَقُصُّوْنَ عَلَیْکُمْ اٰیَاتِیْ فَمَنِ اتَّقٰی وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ (سورۂ اعراف۔ آیت نمبر ۳۵) کو اس کے سیاق و سباق سے الگ کر کے جو نتیجہ نکالا جاتا ہے وہ اس کے برعکس ہے جو سلسلۂ کلام میں اسے رکھ کر دیکھنے سے نکلتا ہے۔ نیز اس مضمون کی جو دوسری آیات قرآن مجید میں ہیں وہ بھی قادیانیوں کی تفسیر سے مختلف ہیں۔ علاوہ بریں قادیانیوں سے پہلے گذشتہ تیرہ سو برس میں کسی نے بھی مذکورۂ بالا آیت کا یہ مطلب نہیں لیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سلسلۂ نبوت جاری رہنے کا ذکر اس میں کیا گیا ہے۔ ذیل میں ان تینوں نکات کی الگ الگ توضیح کی جاتی ہے:۔

سورۂ اعراف میں یہ آیت دراصل قصۂ آدم و حوا کے سلسلے میں آئی ہے جو رکوعِ دوم کے آغاز سے رکوعِ چہارم کے وسط تک مسلسل بیان ہوا ہے۔ پہلے رکوعِ دوم میں پورا قصہ بیان کیا گیا ہے، پھر رکوعِ سوم و چہارم میں اُن نتائج پر تبصرہ کیا گیا ہے جو اس قصے سے نکلتے ہیں۔ اس سیاق و سباق میں رکھ کر آیت کو پڑھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ "یا بنی آدم" کے الفاظ سے مخاطب کر کے جو بات کہی گئی ہے اُس کا تعلق آغازِ آفرینش کے وقت سے ہے نہ کہ نزولِ قرآن کے وقت سے۔ بالفاظِ دیگر اس کا مطلب یہ ہے کہ آغازِ آفرینش ہی میں اولادِ آدم کو اس بات پر متنبہ کر دیا گیا تھا کہ تمہاری نجات اُس ہدایت کی پیروی پر موقوف ہے جو خدا کی طرف سے تم کو بھیجی جائے۔

اس مضمون کی آیات قرآن میں تین مقامات پر آئی ہیں، اور تینوں مقامات پر قصۂ آدم و حوا

کے سلسلے ہی میں اس کو وارد کیا گیا ہے۔ پہلی آیت سورۂ بقرہ میں ہے (آیت نمبر ۳۸) دوسری آیت سورۂ اعراف میں ہے (آیت نمبر ۳۵)۔ اور تیسری آیت سورۂ طٰہٰ میں (آیت نمبر ۱۲۳)۔ ان تینوں آیتوں کا مضمون بھی باہم مشابہ ہے اور موقع و محل بھی مشابہ۔

مفسرین قرآن بھی دوسری روایتوں کی طرح سورۂ اعراف کی اس آیت کو بھی قصۂ آدم و حوا ہی سے متعلق قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ علامہ ابن جریر نے اپنی تفسیر میں اس آیت کے ضمن میں حضرت ابو سیار السلمی کا قول نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے یہاں حضرت آدم اور ان کی ذریت کو یکجا اور ایک ہی وقت میں خطاب کیا ہے"۔ امام رازی اپنی تفسیر کبیر میں اس آیت کی تشریح میں لکھتے ہیں کہ "اگر یہ خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہو حالانکہ وہ خاتم الانبیاء ہیں، تو اس کے معنی یہ ہونگے کہ اللہ تعالیٰ یہاں امتوں کے بارے میں اپنی سنت بیان فرما رہا ہے"۔ علامہ آلوسی اپنی تفسیر روح المعانی میں فرماتے ہیں کہ "یہاں ہر قوم کے ساتھ جو معاملہ پیش آیا ہے اسے حکایۃً بیان کیا جا رہا ہے یہاں بنی آدم سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی امت مراد لینا مستبعد اور ظاہر کے خلاف ہے کیونکہ یہاں جمع کا لفظ "رُسل" استعمال ہوا ہے"۔ (علامہ آلوسیؒ کے ارشاد کے آخری حصے کا مطلب یہ ہے کہ اگر یہاں خطاب امت محمدیہ سے ہو تو پھر اس امت کو یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ "اگر کبھی تم میں رُسل آئیں"، کیونکہ اس امت میں ایک سے زائد رسولوں کے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا)

آیت یٰٓاَیُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ (سورۂ مومنون۔ آیت نمبر ۵۱-۵۲) کو بھی اگر اس کے سیاق و سباق سے الگ نہ کیا جائے تو اس سے وہ مطلب نہیں نکالا جا سکتا جو قادیانی حضرات نے نکالا ہے۔ یہ آیت جس سلسلۂ کلام میں وارد ہوئی ہے وہ رکوع دوم سے مسلسل چلا آ رہا ہے۔ اس میں حضرت نوحؑ سے لے کر حضرت عیسیٰ ابن مریم تک مختلف زمانوں کے انبیاء اور ان کی قوموں کا ذکر کر کے یہ بتایا گیا ہے کہ ہر جگہ اور ہر زمانے میں انبیاء علیہم السلام ایک ہی تعلیم دیتے رہے ہیں، ایک ہی ان سب کا طریقہ رہا ہے اور ایک ہی طرح سے ان سب پر اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہوتا رہا ہے۔ اس کے برعکس گمراہ قومیں ہمیشہ خدا کے راستے کو چھوڑ کر غلط کاری

میں مبتلا ہوتی رہی ہیں۔ اس سلسلۂ بیان میں یہ آیت اس معنی میں نہیں آئی ہے کہ "اے رسولو، جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آنے والے ہو، پاک رزق کھاؤ اور نیک عمل کرو" بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان تمام رسولوں کو، جو نوح علیہ السلام کے وقت سے اب تک آئے ہیں اللہ تعالیٰ نے یہی ہدایت فرمائی تھی کہ "پاک رزق کھاؤ، اور نیک عمل کرو"۔

اس آیت سے بھی مفسرین قرآن نے کبھی یہ مطلب نہیں لیا کہ یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد انبیاء کی آمد کا دروازہ کھولتی ہے۔ اگر کوئی مزید تحقیق و اطمینان کرنا چاہے تو مختلف تفسیروں میں اس مقام کو دیکھ سکتا ہے۔

حدیث لو عاش ابراہیم لکان نبیاً سے قادیانی حضرات جو استدلال کرتے ہیں وہ چار وجوہ سے غلط ہے:۔

اوّل یہ کہ جس روایت میں اسے خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کی حیثیت سے بیان کیا گیا ہے اس کی سند ضعیف ہے اور محدثین میں سے کسی نے بھی اس کو قوی تسلیم نہیں کیا ہے۔

دوم یہ کہ نووی اور ابن عبدالبر جیسے اکابر محدثین اس مضمون کو بالکل ناقابل اعتبار قرار دیتے ہیں۔ امام نووی اپنی کتاب تہذیب الاسماء واللغات میں لکھتے ہیں:۔

اما ما روی عن بعض المتقدمین لو عاش ابراھیم لکان نبیاً فباطل وجھالۃ علی الکلام المغیبات ومجازفۃ وھجوم علی عظیم۔	رہی وہ بات جو بعض متقدمین سے منقول ہے کہ "اگر ابراہیم زندہ ہوتے تو نبی ہوتے" تو وہ باطل ہے اور غیب کی باتوں پر کلام کرنے کی بے جا جسارت ہے اور بے سوچے سمجھے ایک بڑی بات منہ سے نکال دینا ہے۔

اور ابن عبدالبرؒ "تمہید" میں لکھتے ہیں:۔

لا ادری ما ھذا فقد ولد نوح علیہ السلام غیر نبی ولو لم یلد الا نبیا لکان کلّ احد نبیا لانھم من نوح علیہ السلام۔	میں نہیں جانتا کہ یہ کیا مضمون ہے۔ نوح علیہ السلام کے ہاں غیر نبی اولاد ہو چکی ہے، حالانکہ اگر نبی کا بیٹا نبی ہی ہونا ضروری ہوتا تو آج سب نبی ہوتے کیونکہ

سب کے سب نوح علیہ السلام کی اولاد ہیں۔

سوم یہ کہ اکثر روایات میں اسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بجائے بعض صحابیوں کے قول کی حیثیت سے نقل کیا گیا ہے اور وہ اس کے ساتھ یہ تصریح بھی کر دیتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد چونکہ کوئی نبی نہیں ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے آپ کے صاحبزادے کو اٹھا لیا۔ مثال کے طور پر بخاری کی روایت یہ ہے :-

عن اسماعیل بن ابی خالد قال قلت لعبد اللہ بن ابی اوفیٰ رأیت ابراھیم بن النبی صلی اللہ علیہ وسلم ؟ قال مات صغیرا ولو قضی ان یکون بعد محمد صلی اللہ علیہ وسلم نبی عاش ابنہ ولکن لا نبی بعدہٗ (بخاری۔ کتاب الادب۔ باب من سمی باسماء الانبیاء)

اسماعیل بن ابی خالد کہتے ہیں کہ میں نے عبداللہ بن ابی اوفیٰ (صحابی) سے پوچھا کہ آپ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے ابراہیم کو دیکھا ہے ؟ انہوں نے کہا وہ بچپن ہی میں مر گئے۔ اگر اللہ تعالیٰ کا فیصلہ یہ ہوتا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی ہو تو آپ کا صاحبزادہ زندہ رہتا، مگر حضور کے بعد کوئی اور نبی نہیں ہے۔

اسی سے ملتی جلتی روایت حضرت انس سے بھی منقول ہے جس کے الفاظ یہ ہیں :-

ولو بقی لکان نبیا ولکن لم یبق لان نبیکم اخر الانبیاء (تفسیر روح المعانی۔ جلد ۲۲ صفحہ ۳۰)

اگر وہ زندہ رہ جاتے تو نبی ہوتے، مگر وہ زندہ نہ رہے کیونکہ تمہارے نبی آخری نبی ہیں۔

چہارم یہ کہ اگر بالفرض صحابہ کرام کی یہ تصریحات بھی نہ ہوتیں، اور محدثین کے وہ اقوال بھی موجود نہ ہوتے جن میں اس روایت کو جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کی حیثیت سے منقول ہوئی ہے ضعیف اور ناقابلِ اعتبار قرار دیا گیا ہے، تب بھی وہ کسی طرح قابلِ قبول نہ ہوتی۔ کیونکہ یہ بات علمِ حدیث کے مسلمہ اصولوں میں سے ہے کہ اگر کسی ایک روایت سے کوئی ایسا مضمون نکلتا ہو جو بکثرت صحیح احادیث کے خلاف پڑتا ہو تو اسے قبول نہیں کیا جا سکتا۔ اب ایک طرف وہ کثیر التعداد صحیح اور قوی السند احادیث ہیں جن میں صاف صاف تصریح کی گئی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا دروازہ بند ہو چکا ہے اور دوسری طرف یہ اکیلی روایت ہے جو بابِ نبوت کے کھلے رہنے کا امکان ظاہر کرتی ہے۔

آخر کس طرح جائز ہے کہ اس ایک روایت کے مقابلے میں ان سب روایتوں کو ساقط کر دیا جائے؟

بقیہ اشارات

امن یجیب المضطر اذا دعاہ ویکشف السوء - النمل - ۶۲)

یہ خدا جو اپنے بندوں کے سروں پر شفقت کا ہاتھ پھیرتا ہے، جو ان کے جلتے بھنتے سینوں کو تسکین کی ٹھنڈک سے بھر دیتا ہے، جو ان کے آنسو پونچھتا ہے، جو ان کی ڈھارس بندھاتا ہے، جو ان کی امیدوں کے دیوں کی لو کو بار بار اکساتا ہے۔ جو ان کو اپنی نصرت وتائید کا یقین دلاتا ہے۔ اس کا تصور اتنی بڑی طاقت سے انسانی زندگی کو مالا مال کر دیتا ہے کہ اس طاقت کے بل پر آدمی تاریخ میں لازوال کارناموں کے انمٹ نقوش چھوڑ کر رخصت ہوتا ہے۔

اس مختصر اور عجلت سے لکھے ہوئے مضمون میں اگرچہ پوری بات نہیں کہی جا سکی، مگر پھر بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام کا تصورِ خدا انسانی ذہن وکردار کو کس ڈھب سے تعمیر کرتا ہے۔ یہ تصور جس نے جتنا زیادہ جذب کیا وہ اتنی ہی عظیم شخصیت سے مالا مال ہوا، اور جو اس تصور سے اکتسابِ فیض کرنے میں جتنا پیچھے رہ گیا وہ عمل کی دنیا میں اتنا ہی کمزور اور پست رہا! آدمی کے خیالات اور اس کے اعمال گواہی دے دیتے ہیں کہ وہ اسلام کے دیئے ہوئے تصورِ خدا سے بہرہ مند ہے یا نہیں اور ہے تو کس حد تک۔ اس کے اصول، اس کے جذبات، اس کا اخلاق، اس کے معاملات، اس کا طرزِ گفتگو، اس کے آدابِ مجلس، سب کے سب بول بول کے کہتے ہیں کہ اس شخص کا خدا کیسا خدا ہے۔ یا اس نے کیسے تصورِ خدا کو اپنے ذہن میں جگہ دی ہے۔

پس جن لوگوں کو مسلم کی زندگی بسر کرنی ہو، جن کو اسلام کے تقاضوں کو لے کے اٹھنا ہو، جنہیں اسلامی تحریک کا سپاہی بن کے کام کرنا ہو، ان کو سب سے پہلے خدا کی ذات اور اسکی صفات کا شعور حاصل کرنا چاہیے* اور اسے روح کی گہرائیوں میں جذب کرنا چاہیے۔ یہ نہیں تو پھر اور جو کچھ ہے وہ بودا اور سطحی اور نمائشی ہے۔